# ممتاز حسن کی یاد میں

محمد معز الدین

میں یہ دعوی تو نہیں کرتا کہ ممتاز حسن صاحب سے میں بہت قریب تھا۔ مگر میری ان سے شناسائی کچھ ایسی دور کی بھی نہ تھی۔ ممتاز حسن صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے غالباً 1954ء میں مشرقی پاکستان میں دیکھا جب ڈھاکہ میوزیم کا ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ باہر کے جو مہمان آئے تھے ان میں ممتاز حسن صاحب کی شخصیت بڑی نمایاں تھی۔ اگلی صف میں سوٹ میں ملبوس، ایک خاص قسم کی چوڑی بوٹائی، (Bowtle) پہنے، بھرا بھرا جسم اور سنجیدگی کے ساتھ نیم متبسم باوقار شخص جو بیٹھا تھا وہی ممتاز حسن صاحب تھے۔ غالباً اس جلسے کے مہمان خصوصی بھی یہی تھے۔ اس وقت ان سے میرا تعارف نہ ہو سکا۔ ان کی زوردار اور پر اعتماد تقریر سننے کے بعد بے ساختہ جی چاہا کہ ان کے پاس جاؤں۔ مگر وہ چند ممتاز شخصیتوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جن میں ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم، ڈاکٹر باقر، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور، ڈاکٹر حبیب اللہ، صدر شعبہ اسلامی تاریخ و ثقافت، ڈھاکہ یونیورسٹی پیش پیش تھے۔ ان کی جاذب نظر شخصیت کا نقش ذہن پر مرقسم ہو گیا۔

اس کے بعد کئی مرتبہ مجھے ان کو مختلف مجلسوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کبھی ایشیاٹک سوسائٹی کے جلسے میں، کبھی ہسٹری کانفرنس میں، کبھی کسی اور سمپوزیم میں۔ اکثر یہ اسی بوٹائی (Bowtie) میں نظر آتے۔ ان کا وقار اور میری کم آمیزی برابر مانع رہی اور میں کبھی ان کے قریب نہیں گیا۔ اسے حجاب پاس وضع کیجیے یا میری غلط قسم کی خودداری کہ جب تک میرا تعارف کسی سے نہیں ہوتا میں اپنے آپ کو اس پر مسلط نہیں کرتا۔ آخری بار 1970ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے لئے چند اساتذہ کے انتخابی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی تشریف لائے تھے۔ ڈاکٹر سراج الحق، صدر شعبہ عربی کے کمرے میں انٹرویو تھا۔ میں ایک صاحب

سے وہاں ملنے گیا تھا تو ڈاکٹر صغیر حسن معصومی، ڈائریکٹر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پر نظر پڑی۔ ان سے بات کرتے ہوئے ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ممتاز حسن صاحب

---

اقبال اکادمی کے خصوصی جلسہ بہ تقریب ''ممتاز حسن کی یاد میں'' مورخہ 4 دسمبر سنہ 1984ء کو پڑھا گیا۔

---

بھی آ گئے۔ ان سے ڈاکٹر معصومی نے میرا تعارف کرایا۔ یہ تھے تو نہایت عجلت میں مگر رکے، مجھے غور سے دیکھا اور پھر بغل گیر ہوئے اور اس شفقت اور گرم جوشی سے ملے کہ جیسے میری بہت پرانی یاد اللہ ہو اور ان کے اس جملے کی حلاوت میں اب تک نہیں بھولا ''بھائی اچھے ہو'' کیا شیرینی اور اپنائیت تھی اس ایک جملے میں۔ غالباً ان سے قربت کی ایک دیرینہ خواہش کی تسکین تھی جس نے مجھے اس قدر محظوظ کیا۔

میں 1981ء کے اواخر میں چند دنوں کے لئے کراچی آیا تھا اور سقوط ڈھاکہ کے بعد واپس نہ جا سکا کیوں کہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ ہماری زندگی کے روز و شب بدل چکے تھے اور جب میرا تقرر بہ حیثیت ناظم اقبال اکادمی ہوا تو مجھے علم ہوا کہ اس اکادمی کی داغ بیل ان ہی کے ہاتھوں پڑی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ضابطہ (Ordiance) بھی انہیں کا تیار کردہ ہے اور وہ تقریباً پندرہ سال اس اکادمی کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اس کے بانی بھی ہوئے اور نگران بھی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس اکادمی میں نہ کبھی آتے ہیں اور نہ یہاں کے کام سے کوئی دلچسپی ہے۔ کچھ دنوں تک تو میں بھی خاموش رہا مگر ان سے ملنے کے اشتیاق کو میں زیادہ دنوں تک نہ دبا سکا اور ایک روز جب میں نے ٹیلی فون کیا اور حاضر خدمت ہونے کی خواہش ظاہر کی تو بڑی شفقت سے جواب دیا کہ ضرور آیئے! کل پانچ بجے ٹھیک رہے گا۔ مجھے بھی اشتیاق ہے ٹیلی فون میں نائب صدر سید

عبدالواحد صاحب کے کمرہ سے کر رہا تھا۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں گے۔ اور یہ بھی بتایا کہ وہ ان کے دیرینہ کرمفرما اور دوست ہیں اور ان کے برابر ہی کے مکان میں رہتے ہیں۔ دوسرے دن میں جب ان کے گھر پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ ممتاز صاحب باہر گیٹ پر ٹہل رہے ہیں۔ اور میرا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو ٹھیک پانچ بجے تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ دیر سے نہیں پہنچا ورنہ انہیں انتظار کی زحمت اٹھانی پڑتی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ میں نے کہا کہ سید صاحب نے بھی آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے میں انہیں بلا لوں؟ انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہا کہ گویا آپ سے نہیں بلکہ میری ملاقات اقبال اکادمی سے ہوگی اور بغیر کسی تامل کے آگے بڑھے اور کہا کہ آیئے میں خود ان کو ساتھ لے کر آتا ہوں اور میرے آگے آگے وہ ان کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئے۔ گھنٹی بجائی۔ واحد صاحب جب باہر نکلے تو مزاج پرسی کے بعد ان کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی اور نہایت تپاک سے ہم دونوں کو اپنے ڈرائینگ روم میں لائے جہاں بار بار میری نظر ان کی بڑی سی تصویر پر پڑتی جو کسی آرٹسٹ نے بڑے فنکارانہ طور پر بنائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز صاحب مصروف مطالعہ ہیں۔ اتنے میں مشتاق خواجہ صاحب بھی تشریف لائے۔ چائے اور رسمی باتوں کے بعد واحد صاحب تو چلے آئے مگر ہم لوگوں سے تقریباً دو گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے اور اس خلوص اور سادگی سے ملے کہ مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ ان سے میری باضابطہ یہ پہلی ملاقات ہے۔ جب میں چلنے لگا تو اپنی ایک انگریزی تصنیف In Quest Of Daibal دی اور فرمایا کہ چند وجوہات ہیں جن کی بناء پر میں اکادمی تو نہ آؤنگا مگر آپ مجھ سے ملتے رہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ یہاں آ گئے۔ جب ہم لوگ اٹھے اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگے تو اصرار کر کے گاڑی تک ساتھ آئے۔ عجب اتفاق کہ ہماری گاڑی کے اسٹارٹ ہونے میں

دقت ہوئی ۔ میں پریشان ہو کر نیچے اترنے والا ہی تھا کہ کسی کو آواز دوں کہ انہوں نے مجھے بہ اصرار گاڑی میں بٹھا دیا اور کہا کہ یوں نہیں آپ بیٹھیں میں دھکا دیتا ہوں اور نہایت زور سے گاڑی پیچھے دھکیل دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ میں سخت شرمندہ ہوا مگر یہ مسکراتے رہے اور کہنے لگے کہ بھائی اکثر یہ میرے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ابھی مجھ میں اتنی طاقت ہے۔ میں سخت حیران کہ یہ ہیں ممتاز حسن صاحب، مالیات کے سابق سیکرٹری، نوابزادہ لیاقت علی خان کے دست راست، بیشمار علمی اور ادبی انجمنوں کے صدر اور ملک کے ممتاز دانشور، کہاں وہ بوٹائی والی مرعوب کن شخصیت اور کہاں یہ خاکسار اور درویش منش انسان مولوی عبدالحق صاحب نے صحیح کہا ہے کہ انسان کا صحیح مطالعہ انسان ہے۔ اس کے بعد ی میری ان کی متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی کسی ادبی جلسے میں اور کبھی گھر پر۔ ایک بار انجمن ترقی اردو کراچی میں پروفیسر شیمل نے تصوف پر ایک لیکچر دیا۔ ممتاز حسن صاحب نے بھی گفتگو کی۔ نہایت جامع اور مدلل اور اردو فارسی کے صوفی شعراء کے ذکر کے ساتھ فلسفہ تصوف پر بھی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد جب میری ملاقات ہوئی اور اس تقریر کا میں نے ذکر کیا تو پوچھا کہ پسند آئی؟ میں نے کہا کہ اگر گستاخی معاف ہو تو ایک بات عرض کرنے کی جسارت کروں۔ کہنے لگے ضرور۔ میں نے کہا کہ تصوف کے پیر و مرشد مولانا رومی کی مثنوی کا جب بھی میں مطالعہ کرتا ہوں تو ایک بات کھٹکتی ہے اور وہ میں پروفیسر شیمل سے تو نہیں پوچھ سکتا مگر آپ سے دریافت کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ اکثر حکایتوں میں وہ ایسے فحش اشعار لکھتے اور مثالیں ایسی پیش کرتے ہیں کہ اگر یہ اشعار الگ کر لئے جائیں تو اچھا خاصا فحش ادب Pornographic Literature تیار ہو جائے گا۔ میں تصوف کی راہ سے نہیں گذرا۔ مجھے یہ باتیں کھٹکتی ہیں کہاں وہ مسائل تصوف اور کہاں یہ حکایتیں۔ ہنسے اور کہنے لگے کہ آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے۔ اس کا جواب میں ابھی نہیں دوں گا۔ گھنٹوں اس موضوع

پر گفتگو کروں گا۔ کیا پتہ تھا کہ وہ گھڑی کبھی نہیں آئے گی۔ نہ جانے کیا کہتے اور کس انداز میں کہتے۔ ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔

اچانک ایک روز خبر ملی کہ ان کی اہلیہ اللہ کو پیاری ہوئیں۔ میں نے اکادمی سے ان کے پرانے ناطے سے اس روز اکادمی میں ایک تعزیتی جلسہ کر کے قرارداد ان کی خدمت میں بھجوادی اور خود بھی تجہیز و تکفین میں شریک ہوا۔ دوسرے روز صبح سویرے معلوم ہوا کہ ممتاز صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں بھاگا بھاگا نیچے آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اکادمی کے اندر ان کی گاڑی کھڑی ہے اور خود ایک اونی فرغل زیب تن کئے، ہاتھ میں چھڑی لئے اکادمی تشریف لائے ہیں۔ میں حیران کہ آج کیسے علی الصبح زحمت فرمائی۔ دیکھتے ہی بولے، بھائی میں آپ اور سید صاحب (سید عبدالواحد صاحب) کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ لوگوں نے میری غم میں میرے ہمدردی کی اور شریک ہوئے۔ میں آپ کا خاص طور سے شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اور یہ بتانے کہ فلاں روز قرآن خوانی ہے تھوڑی دیر بیٹھے اور پھر خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شریک حیات کا غم ہے۔ جاتے جاتے جائے گا۔ وقت بڑا مرہم ہے۔ آدمی سخت جان ہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت جھیل جاتا ہے۔ اور کرے بھی تو کیا بقول رضا علی وحشت

اللہ رے زور مجبوری، یہ سوچ کے حیرت ہوتی ہے
جو بوجھ اٹھانا پڑتا ہے کیونکر وہ اٹھایا جاتا ہے

میرے قریب آئے اور کہنے لگے۔ بھائی میری وہ صرف رفیقۂ حیات نہ تھیں بلکہ بچپن کی دوست۔ شاید آپ کو معلوم نہیں مرحومہ میری چچا زاد بہن بھی تھیں اور ایک ہی گھر میں ہم دونوں کا بچپن گزرا تھا۔ ماضی کی کتنی یادیں ہیں جو دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہیں۔ اور یہ بھی سنیے کہ اقبال سے میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا نام اقبال بانو تھا۔ میرے پاس لفظ نہ تھے کہ میں ان کی دلجوئی کرتا۔ اس

کے بعد اکثر وہ ٹیلیفون کرتے۔ عموماً صبح سویرے اتنا سویرے جب بھی ٹیلی فون آتا بچے کہتے کہ ممتاز صاحب کا ہوگا۔ بھائی اچھے ہو ضرور کہتے۔ کبھی کسی کتاب کے متعلق پوچھتے، کبھی کسی مضمون کے متعلق، کبھی کہتے کہ میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ ذرا فلاں کتاب میں دیکھئے کہ یہ شعر اس طرح تو نہیں۔ آپ کے یہاں جو کتابیں چھپی ہیں ان کی ایک ایک کاپی بھجوا دیجئے۔ جتنا کمیشن آپ دے سکیں دے دیں۔ مگر میں مفت نہیں لوں گا۔ مجھے ایک کالج لائبریری میں دینی ہیں۔ میں نے کتابیں بھجوا دیں۔ انتقال سے کچھ دن پہلے شکریہ کے خط کے ساتھ چیک بھیج دیا تھا۔

اقبال کے صد سالہ جشن ولادت کے سلسلے میں جو نیشنل کمیٹی بنی ہے اس کی ایک کمیٹی کے کنوینر تھے۔ باہر کے جو اسکالر اس کانفرنس میں آئیں گے ان کی ایک فہرست بنائی تھی۔ مجھے سے کہا کہ میں یہ فہرست آپ کے ساتھ بیٹھ کر بنانا چاہتا ہوں۔ میرے پاس گاڑی نہیں ورنہ میں خود آتا۔ اس سلسلے میں ان کے ہاں کئی بار میرا جانا ہوا۔ کمال شفقت سے ملتے۔ ایک ایک نام پر بحث کرتے۔ اور کہتے کہ اس کو بھی رکھو۔ میں نے کہا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر فلاں شخص کو اقبال سے کیا تعلق۔ کہتے کہ بھائی اتنا بڑا عالم ہے، اگر چند سطریں بھی آپ کی فرمائش پر اقبال پر لکھ دے گا تو وہ سند ہوں گی۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے کہ اچھا جس پر میں اے کہوں اے بناؤ اور جس پر بی کہوں بی بناؤ، میں نے کہا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگے کہ دو کٹیگری کے لوگ ہیں۔ پھر جب میں بی بناتا تو کہتے کہ نہیں اے بناؤ۔ اور آخر میں تقریباً سب کو اے کروایا۔ اس وقت میں سوچتا تھا کہ جب سب کو بلانا ہے تو پھر اے اور بی کا کیا سوال۔ اور اب سوچتا ہوں کہ دراصل ان میں اتنی فراخدلی تھی کہ سب کو برابر سمجھتے تھے۔ انتقال سے چار پانچ روز پیشتر یہ فہرست تیار کر لی تھی اور مجھے معلوم نہیں کہ اس میں کیا ردوبدل ہوا۔ مگر آخری لسٹ کی ایک کاپی میرے پاس بھی آئی ہے۔ جس میں غالباً غلطی سے دو ناموں کے سامنے بی کے نشان ہیں ورنہ سب

کے آگے اے بنے ہوئے ہیں۔ آخری بار اس سلسلے میں جب میں ان سے ان کی وفات سے چار پانچ روز پیشتر ملا تو رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ اور باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے کہ میں آج یہیں بیٹھوں گا۔ مرحومہ کے ساتھ اکثر میں یہاں بیٹھا رہتا تھا۔ اور بار بار اقبال کے یہ اشعار پڑھتے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یاسیں وہی طاھا

کچھ تھکے تھکے سے تھے۔ پوچھا کچھ منگواؤں تھوڑی دیر کے بعد کہنے لگے، جایئے آپ دن بھر کے تھکے ہوں گے۔ فہرست تو تیار ہے۔ آپ اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ مجھے بڑی فکر تھی۔ الحمدللہ یہ فہرست تیار ہو گئی۔ اب پیر صاحب (پیر حسام الدین راشدی) کے حوالے کر دونگا۔ میرا کام ختم ہو گیا۔ مجھے اس وقت اندازہ نہ ہو سکا کہ انہیں کیوں اتنی جلدی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ کار دفیا کسے تمام نہ کرو۔ مگر ممتاز صاحب نے تو اپنے ہاتھ کے تمام کام نمٹا لئے تھے۔

کیا سادہ طبیعت تھی۔ جب بھی گیا کبھی ایسا نہ ہوا کہ گاڑی تک چھوڑنے نہ آئے ہوں۔ جب میں گیٹ سے باہر گاڑی نکال لیتا تو دیکھتا کہ ممتاز صاحب اپنی جگہ پر کھڑے ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ ایک روز ان کے یہاں کچھ مہمان خواتین بھی تھیں۔ میں نے اصرار کیا کہ آپ تشریف رکھیں۔ اس روز برآمدے سے لوٹ گئے۔ ہمارے ساتھ ایک صاحب آئے۔ میں سمجھا کہ غالباً یہ میرے ساتھ چلیں گے اور کہیں راستے میں اتر جائیں گے۔ میں نے دروازہ کھول کر انہیں بیٹھنے کو کہا تو کہنے لگے کہ نہیں نہیں مجھے تو ممتاز صاحب نے آپ کو خدا حافظ کہنے کو بھیجا ہے۔ اللہ اللہ کیا

وضعداری تھی۔

گذشتہ یوم اقبال کے موقع پر مورننگ نیوز میں ان کا ایک نہایت عمدہ مضمون اقبال پر شائع ہوا۔ اسی صفحے پر اتفاق سے میرا بھی ایک چھوٹا سا مضمون تھا۔ صبح صبح ٹیلی فون آیا۔ کہنے لگے مجھے بھی یہ سعادت حاصل ہوئی کہ آپ کے مضمون کے ساتھ میرا مضمون چھپا ہے۔ اس کی تعریف کی اور کہا انگریزی زبان کو نہ چھوڑیئے۔ گاہے گاہے لکھتے رہیئے۔ اللہ دے حوصلہ افزائی۔

جب بھی جاتا باتوں باتوں میں نصیحت کرتے جاتے۔ ایک بار کہنے لگے کہ زندگی میں بڑی چیز کو ہاتھ سے جانے نہ دو، اور چھوٹی چیز کی پوا مطلب ہوا کہ تم مغلوب ہو گئے اور حالات تم پر غالب۔ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے۔ زندگی میں تکمیل آرزو کی خواہش نہ کرو بلکہ آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ کبھی کہتے خدمت خلق خلق کا جذبہ بجائے خود تکمیل انسانیت ہے اور اپنے ایک مضمون کا آف پرنٹ لے آئے۔ دیکھا تو عنوان ہے احترام انسانیت اس کا پہلا ہی جملہ توجہ طلب ہے۔ انسانیت احترام انسانیت کا نام ہے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ انسانیت کا صحیح احترام یہ ہے کہ ہم ہر انسان کی اچھی صلاحیتوں کی حفاظت کریں اور ان کے نشو ونما کے لئے تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ امتیاز ہمارا قائم کیا ہوا ہے۔ ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کوئی آدمی عام آدمی نہیں ہے۔ ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صلاحیت کوئی نہ کوئی خوبی ایسی ضرور موجود ہے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ یہ امتیازی خصوصیت کہیں تو خود بخود ابھرتی ہے اور کہیں اسے پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جہاں تک صلاحیتوں کی حفاظت اور نشوونما کا تعلق ہے ہر انسان توجہ کا مستحق ہے۔ معاشرے میں بڑے چھوٹے کے امتیاز کو ختم کر دینے اور مساوات قائم کرنے پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خدا کی پرستش احترام انسانیت کی بنیاد ہے۔

مطبوعہ ''فکر و نظر'' ادارہ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد، بابت مارچ 1983ء

جہد عمل و خدمت خلق کا جذبہ انہیں ہمیشہ سیاب وش، بے قرار اور بے چین رکھتا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سخت گوشی سے ہے تلخ زندگانی آنگیں۔ وہ زندگی کے علائق سے نہیں حقائق سے نبرد آزما تھے۔ جس روز وہ اللہ کو پیارے ہوئے اس روز جس دعوت میں شرکت کرنے والے تھے اس میں یہ خاکسار بھی شریک تھا اور ان کا ہر لمحہ انتظار تھا کہ یہ منحوس خبر وہیں ملی اور میں اور ڈاکٹر ریاض الاسلام، صدر شعبہ تاریخ، کراچی یونیورسٹی، جب ان کے گھر پہنچے تو پیر حسام الدین راشدی اور فضل کریم فضلی صاحب کے علاوہ ان کے گھر کے پیشتر افراد موجود تھے۔ ان سے اجازت لے کر جب کمرے میں گیا تو کسی نے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ اسی وقار اور سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ لیٹے تھے جیسے کوئی محو خواب ہو۔ اس وقت علامہ اقبال کا یہ شعر خود بخود میرے لب پر آ گیا۔

نشان مرد حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم پر لب اوست

ہم دست بدعا ہیں کہ:

رحمتوں کی تیرے مرقد پر فراوانی رہے
تا قیامت بارش انوار یزدانی رہے